مولانا مودودیؒ کا منفرد اسلوبِ تحریر

احمد جاوید ○

مولانا مودودیؒ پر گفتگو کرتے ہوئے، ان کے لیے 'انشا پرداز' کا لفظ استعمال کرنا مناسب نہیں ہے۔ انشا پردازی کا لازمہ ہے مبالغہ، یعنی دیکھے ہوئے کو زیادہ دکھانا۔ جب اس لفظ کے تحت بات کریں گے تو ہم اس دائرے میں محدود رہیں گے کہ 'ان کی انشا میں کیا امتیازات ہیں؟'

مولانا جس زمانے میں لکھنا شروع کر رہے تھے، اس زمانے میں مذہبی علوم اپنے اظہار کے سبک اسالیب پیدا کر رہے تھے۔ تاہم، فضا میں گردش کرتا مشہور فقرہ یہ تھا کہ ''مولوی کو لکھنا کیا آئے؟'' یا ''مولوی کو زبان نہیں آتی''۔ کچھ لوگوں نے اس صحیح اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کمی کا ازالہ کیا۔

مثال کے طور پر شبلی نعمانی [م: ۱۹۱۴ء] نے دین کے ساتھ ذہنی تعلق کے جتنے اسالیب اور جتنے بھی راستے ہو سکتے ہیں، ان سب کو ایک معروضی انداز کی نثر میں لکھنا شروع کیا۔ اس میدان میں وہ خود ایک دبستان ہیں۔ اس سب کے باوجود ان کی تحریروں سے آدمی کے اندر مذہبی نمو کے آثار نہیں پیدا ہوتے تھے۔ وہ سیرت بھی لکھتے تو اس طرح لکھتے کہ اس سے معلومات میں کچھ اضافہ ہو گیا یا جو روایات غلط تھیں، ان کو اپنی حد تک انھوں نے صحیح کر دیا، لیکن اس کارِ تصنیف سے صاحبِ سیرتؐ کے ساتھ وہ ربط و تعلق محسوس نہیں ہوتا جو درکار ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کی نثر میں کمی تھی۔ معاملہ دراصل یہ تھا کہ انھوں نے اپنے آپ کو محقق بنانا قبول کیا تھا، اس لیے ان کی نثر محققین کی طرح کی تھی اور اس زمانے میں رائج مغربی تصور کے اثرات کے تحت تھی کہ چیزوں کو detachment [ناوابستگی] اور objectivity [واقعیت] کے ساتھ بیان کیا جائے۔ مطلب یہ کہ اس میں جذبے یا اپنے تعلق یا کسی درجے کی احساساتی کمیونی کیشن نہ کی جائے۔

○ سابق ڈائریکٹر، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔ فاران کلب کراچی میں خطاب۔ ادارہ

ہمارے ہاں اس اسلوب کی سب سے بڑی مثال شبلی ہیں۔

اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد [م: ۱۹۵۸ء] ایک بڑے آدمی تھے۔ انھوں نے ایک طرح سے ادب کو مذہب پر غالب کر دیا تھا۔ اُنھوں نے ادب اور نثر کی خطیبانہ قسم کو مذہبی مضامین پر حاوی کر دیا تھا۔ ان کی خطابت کا زور شور اتنا ہے کہ آدمی کو بے دست و پا اور مبہوت کر دیتا ہے، لیکن کچھ سمجھا تا نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ جو علمی اضافہ ایک قاری اور متلاشی کو درکار ہے، ایک سادہ دلیل کے ذریعے، وہ ان کے یہاں نہیں ہے۔ بہرحال وہ نثر میں ایک بلند آہنگ خطیبانہ اسلوب کے بانی ہیں۔ اس لیے اگر ہم دینی لٹریچر میں نثر کے ممتاز اسلوب کے آغاز کا سوال اُٹھائیں، تو اس کا جواب ہے: وہ ابوالکلام ہیں۔

پھر عبدالماجد دریابادی صاحب [م: ۱۹۷۷ء] نے اچھی نثر لکھی۔ سیّد مناظر احسن گیلانی صاحب [م: ۱۹۵۶ء] کا ذکر یہاں خاص طور پر کرنا چاہوں گا۔ شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد یا عبدالماجد دریابادی کی نثر میں ایک کسر رہ گئی تھی اور بہت بنیادی کمی تھی، وہ یہ کہ وہ خیال کو passion [اشتیاق] نہیں بناتے تھے۔ دینی کام ہو ہی نہیں سکتا، چاہے وہ علمی ہو، کلامی ہو یا قانونی ہو، جب تک وہ ایک شدید احساس بن کے قاری میں منتقل نہ ہو۔ یعنی ایک صحیح خیال اور اس صحیح خیال کی حرارت دل میں اور روشنی ذہن میں اُتر جائے۔ یہ ہمارے سلف کا طریقہ تھا۔ ہمارے اسلاف کی تحریریں اگر آپ دیکھیں، جس کی بظاہر اُمید کم ہے، لیکن بہرحال جب پڑھیں گے تو آپ کو احساس ہوجائے گا کہ یہ تحریریں میری شخصیت میں چند قیمتی عناصر کا اضافہ کر رہی ہیں۔

آپ ابواسحاق شاطبی [م: ۱۳۸۸ء] کو پڑھ لیجیے۔ ان کی اصولِ فقہ پر کتاب الموافقات فی اصول الشریعۃ ہے۔ اس کو پڑھیں تو وجد آنے لگتا ہے۔ کبھی لگتا ہے کہ افلاطون کو پڑھ رہے ہیں۔ کبھی کچھ لگتا ہے اور کبھی کچھ لگتا ہے۔ یعنی شعور کی تربیت اور وجود کی تراش خراش کرنے والی تمام قوتیں ان کی تحریر میں جمع ملتی ہیں۔ وہ اگر بات کر رہے ہیں تو پیش نظر چیز کا بالکل درست علم فراہم کرتے ہوئے، اس چیز کے وجود کے احوال کو اس کی بنیادی معلومات کے فہم کے ساتھ آپ کے خیال کی دُنیا میں داخل کر دیتے ہیں۔ یہ بات نئے لوگوں میں نہیں ہے۔ سلف کا جو اسلوبِ ابلاغ ہے اور ان کے ہاں جو جذبۂ اظہار ہوتا تھا، وہ مناظر احسن گیلانی تک پہنچ کر ختم ہوگیا۔

النبی الخاتم کو پڑھ کر بہت سے لوگ مسلمان ہوئے ہیں۔ اسی طرح اور بہت سے لوگ ہیں جو سادہ نثر لکھ رہے تھے۔ انھوں نے اپنا مقصود یہ بنایا تھا کہ دین اور اس کی ضروریات کو اور دین کو مانتے ہوئے اس کے ضروری استدلال کو ایک متوسط درجے کے قاری تک پہنچا دیں۔

میں ذاتی طور پر مولانا اشرف علی تھانویؒ کو اپنا مربی مانتا ہوں۔ یہ اس لیے بتا رہا ہوں کہ یہ جو یبوست اور گھٹن طاری ہے کہ لوگ اختلاف کو انقطاع کا سبب بناتے ہیں، یہ کسی بھی طرح کم ہو۔

مولانا مودودی نے اپنا مقصود یہ بنایا کہ تحریر سے قاری کے ذہن کی صفائی ہوتی رہے اور ارادے کو تحریک ملتی رہے۔ انھوں نے ارادے کا محرک بننے والی نثر لکھی۔ ایسی نثر لکھی جو ارادے کو مضبوط کرتی ہے، دماغ کو اس منزل کی طرف یکسو کرتی ہے، جسے عمل سے حاصل کیا جائے گا۔ انھوں نے دین کا قابلِ عمل ہونا بہت ہی کامیابی سے بیان کیا۔

دوسری چیز جو ان کے زمانے میں کہیں نہیں تھی، وہ یہ سوال ہے کہ دین اسلام کے ماننے والوں کی اجتماعیت کن اصولوں پر تشکیل پاتی ہے؟

ہم ابھی تک یہ بات سننے کے عادی تھے کہ فرد کے لیے دین کیا تقاضا رکھتا ہے؟ فرد کے لیے دین سے مستفید ہونے کے کیا کیا ذرائع ہیں؟ اور 'تزکیہ' کا مفہوم صرف 'تزکیۂ افراد' تھا۔ مولانا کی یہ بہت بڑی عطا (contribution) ہے کہ انھوں نے 'تزکیہ' کے اس تصور میں چھپی ہوئی محدودیت کو کھول دیا اور تنگی کو توڑ دیا۔ اس پوسٹ کلونیل دور میں دین کی حفاظت اور مضمحل ہوجانے والی مسلم نفسیات کو دوبارہ سے زندہ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ افراد پر توجہ کے بجائے اس قوم کو اُمت کا ایک فعال حصّہ بنایا جائے۔ وقت کی اس ضرورت کو مولانا نے خوبی سے پورا کیا۔

تیسری بات یہ ہے کہ انھیں پڑھتے ہوئے خیال پر ذہن مطمئن اور تاثّر پر قلب شانت [مطمئن] ہوجاتا ہے۔ مولانا کے ہاں یہ چیز اس طرح سے ہے کہ یہ آپ کے ارادے کو اللہ کی مراد کے مطابق ڈھالنے کے لیے، اور اس ارادے کی حرکت کے نتیجے میں جو مفاد مطلوب ہے، اسے اجتماعی اثاثے اور اجتماعی جذبے کی شکل میں پیش کرتی ہے۔ وہ ارادہ، محض فرد کے کسی اُخروی تزکیے والے مفاد سے نہیں پورا ہوسکتا۔ انھوں نے اس تزکیے کے عمل کو اجتماعی ضرورت بنایا اور تزکیے کے اجتماعی رول کو بالکل علمی انداز میں ثابت کر کے دکھا دیا کہ اجتماعی تزکیے کے بغیر انفرادی تزکیہ نہیں ہوسکتا۔

آپ آج کے حالات دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں صرف یہی چیز بچاسکتی ہے کہ اگر ہم نے اسلام کو اپنے مرکزی اور ثانوی تمام تشخص کا واحد منبع اگر نہ بنایا تو ع

'تمھاری' داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یہ بنیادی اصول مولانا نے سکھایا۔ مسلمانوں کی اجتماعی دینی حمیت اور مسلم نفسیات پر چھائی ہوئی غلامی کے نتیجے میں افسردگی کو انھوں نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور دینی لٹریچر میں اس غلامانہ ذہنیت کا سانچا توڑ کر دکھا دیا۔ یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔

انقلاب کسے کہتے ہیں؟ انقلاب کا مطلب ہے موجودہ اقدار اور اس کے مظاہر کا بالکل بدل جانا، یعنی باطن بھی بدل جائے اور ظاہر بھی بدل جائے۔ مولانا مودودی نے اس ضرورت کو جس عمدگی، جس جامعیت اور جس consistency کے ساتھ پورا کیا ہے، اور دین کے فہم، دین کے احکام اور دین کے عقائد کو، عمل کی ڈوری میں پرونے کا کامیاب مشن انجام دیا، اس کی افادیت اب پتا چلے گی کہ جب اجتماعیت کو نظرانداز کرنے کے نتیجے میں ہر ایئرپورٹ پر واپس کیے جاؤ گے، تب اس بات کا احساس ہوگا کہ اگر ہم ایک اجتماع میں ڈھل چکے ہوتے، ہم اپنی مثبت سوچ کے ساتھ اپنی اجتماعی تشکیل اور اس اجتماعی تشکیل کی برکات دُنیا کو دکھا چکے ہوتے، تو آج اس طرح ذلیل نہ ہو رہے ہوتے۔

آج سماجی اور ریاستی سطح پر وہ ماحول ہے کہ نظام بدلے بغیر فرد کا 'تزکیہ' ناممکن ہے۔ سیاسی نظام، حکومت، ریاست ان سب کا امتزاج (Synthesis) نہ ہوا، تو اب فرد کا 'تزکیہ' بھی ناممکن ہوکر رہ گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انکارِ دین کے اتنے مظاہر پیدا ہو چکے ہیں، اور دین کو چھوڑنے کے اتنے وسیلے پھیل چکے ہیں کہ آدمی اپنے آپ کو اس بہاؤ میں بہنے سے روک نہیں سکتا۔ اس بہاؤ کے سامنے روک لگا کر دوسرے چشمے سے ہمیں پانی جاری کروانا ہے۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے کہ ریاستوں کی یکجائی، یکسوئی اور مکمل شمولیت اور نظام کے اسلامی ہوئے بغیر یہ ہوسکے۔

مولانا مودودی کی منطق آج سمجھ میں آتی ہے۔ مولانا کا جو یہ پیغام ہے یا ان کی دینی فکر کا یہ خلاصہ ہے کہ ''انسان پر اثرانداز ہونے والے آرڈر (نظام) کو بدلو۔ وہ آرڈر اگر ٹھیک ہوگا تو آدمی بھی ٹھیک ہوگا''۔ وہ آرڈر اگر بے حیائی وغیرہ کو مسلط کیے رکھے گا، تو میں کب تک دوسری نظر ڈالنے سے بچ سکوں گا۔ میں کہتا ہوں کہ آج ہم نہیں بچ سکتے۔ مطلب یہ کہ سوسائٹی اسلامی ہو ہی نہیں سکتی،

جہاں ڈھیلے ڈھالے معنی میں دوسری نظر سے مرد کا روکنا آسان نہ ہو۔ دوسری نظر سے مراد وہ حدیث ہے کہ پہلی نظر مباح ہے اور دوسری نظر کا وبال ہے۔ اب آپ اس سے کہاں تک بچیں؟

دین کی تمام اقدار، تمام نفسیاتی اصول اور اخلاق کی تعمیر کرنے والے تمام احکام، روزانہ قدم قدم پر سامنے آنے والی معذوری کی نذر ہو رہے ہیں۔ ہمارا پورا دین معذوری کی نذر ہو رہا ہے اور اس پر تجدد کے حلقوں میں جیسے خوشی کی لہر دوڑی ہوئی ہے کہ وہ دین کے دائرۂ اثر اور دائرۂ کار کو محدود سے محدود تر کرتے جائیں اور سکیڑتے چلے جائیں اور وہ یہ کر رہے ہیں۔ ایمانی حرارت اور روح کے مطابق اس احساس کی اہمیت کو اُجاگر کرنا، دین کے ہر دعوے دار پر لازم ہے۔ مولانا مودودی کا اُمت پر ایک بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اس فکرمندی کو پروان چڑھایا۔

بلاشبہہ میں مولانا کی فکر کے کئی بنیادی اجزا سے اختلاف رکھتا ہوں، لیکن اس کے باوجود ان کا یہ احسان سمجھتا ہوں کہ انھوں نے ہماری دین داری کے پورے اسٹرکچر [ڈھانچے اور ہیکل] کو اس نالائق قوم میں تعمیر کر کے تو دکھا دیا۔ اب چاہے اس سائبان میں کوئی رہنے آئے یا نہ آئے، وہ ان کا کام نہیں ہے۔ اس لیے ایک تو یہ کہ دین کی کلیت اور اس کے حصول کے عملی اور فکری راستے مولانا کے علاوہ کہیں نہیں ملیں گے، پورے اسلامی لٹریچر میں نہیں ملیں گے۔

اپنی دانست میں آپ کے سامنے مولانا مودودی کی نثر پہ بات کر رہا ہوں۔ ان کے ہر مضمون کی روح اور مرکزی خیال دعوتِ انقلاب ہے۔ ان کی ہر بات کے پیچھے mother meaning یہ ہے کہ 'خود کو مکمل طور پہ بدلو اور دُنیا کو مکمل طور پہ بدلو'۔ اب یہ فکر اپنے آپ کو ادبی خرابیوں سے بچاتے، اخلاقی نقائص سے محفوظ رکھتے ہوئے اور اپنے مخاطب کی تحقیر کیے بغیر بھی کس طرح کی نثر میں بیان ہوسکتی ہے؟ دوسری طرف معاملہ یہ ہے کہ انقلابی بنیادی طور پر سخت دل اور بہت اُجڈ ہوتا ہے، وہ چاہے کوئی ہو۔ وہ مخاطب کو بے قیمت، کم فہم اور فکر و دانش سے عاری مخلوق کی طرح سمجھتا ہے۔ مگر معروف انقلابیوں کی یہ مسلّمہ بیماری، مولانا مودودی کے نثری اسلوب اور ان کے دلائل میں کہیں نظر نہیں آتی۔

پھر یہ کہ ہر انقلابی کی سب سے بڑی دلیل وہ خود ہوتا ہے، یعنی خود کو بنا کر پیش کرتا ہے۔ مولانا کے ہاں یہ 'خود' غائب ہے۔ مولانا کی تحریر میں، ان کی گفتگوؤں میں، ان کی نشستوں میں وہ موضوعِ گفتگو بننے سے مکمل گریز کرتے تھے۔ میں نے کم لوگ دیکھے ہیں جو اپنی تعریف برداشت

نہ کرتے ہوں اور غیبت کو اپنی مجلس میں دَر آنے کی اجازت نہ دیتے۔ مگر مولانا کا یہ کرامت کے درجے کو پہنچا ہوا مزاج تھا۔ برصغیر کی تاریخ میں سرسیّد کے بعد مولانا کو بدترین مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور اس میں بہتان، اتہام کی انتہاؤں کو دیکھنا پڑا۔ یہ تو ہمارا مذہبی اور سیاسی کلچر ہے کہ مخالف کو متہم کرو، اس پر کوئی بھی بدترین بہتان لگاؤ۔ مولانا پر کیا کیا بہتان نہیں لگائے گئے؟ لیکن انھوں نے کسی کا نوٹس نہیں لیا اور پھر یہ کہ بہتان لگانے والے کا ذکر اگر ان کی محفل میں آجاتا تھا تو کہتے تھے کہ چھوڑیں! کوئی اور بات کریں۔ جو لوگ مولانا سے ملے ہیں وہ یہ بات جانتے ہیں۔ وہ کبھی کسی کے بارے میں کوئی ہلکی بات نہیں کہتے تھے۔ کبھی کسی غائب آدمی کے بارے میں ذاتی شکایت کی بات نہیں سنتے تھے۔ کوئی ان کے سامنے یہ بات کَہ ہی نہیں سکتا تھا اور اپنا فقرہ مکمل نہیں کرسکتا تھا۔

یہ وہ انقلابی ہے جو وارثِ انبیاؑ ہوتا ہے۔ انبیاؑ اپنے آپ کو عاجز بندے کی طرح مرکزِ ایمان بناتے ہیں۔ اس سے آپ انبیاؑ کی مشکل کا اندازہ کیجیے۔ اپنے آپ کو غیر مشروط طور پر منوانے کا جو انداز ہے، وہ انبیاے کرامؑ عاجزی کے ساتھ اختیار کرتے ہیں۔ ان کے اس اتباع کا جو بڑا نمونہ ہمارے ہاں پایا جاتا ہے، وہ مولانا مودودی ہیں۔

مولانا بنیادی طور پر خطیب نہیں تھے، ان کی دعوت کا بہت کم حصّہ تقریری ہے، دراصل وہ تحریر کے آدمی تھے۔ ان کی تحریر میں سب سے بڑا ادبی وصف یہ ہے کہ یہ ایک طرح سے 'سہل ممتنع' میں لکھی گئی نثر ہے۔ 'سہل ممتنع' شاعری کی اصطلاح ہے، لیکن اگر یہ اصطلاح کسی کی نثر پر وارد کی جاسکتی ہے تو وہ مودودی صاحب کی نثر ہے۔

'سہل ممتنع' کسے کہتے ہیں؟ اسے یوں سمجھیے کہ اگر آپ کسی کو یہ کہیں کہ 'کھانا تناول فرمالیجیے' تو وہ کہے گا کہ یہ جملہ بڑا مشکل ہے۔ لیکن 'سہل ممتنع' اسے کہتے ہیں کہ سنتے اور لکھتے اور پڑھتے وقت کوئی قول یا کوئی شعر یا کوئی بیان ایسا لگے کہ اس کے پیچھے جھانکنے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہو۔ پہلے ہی تاثّر میں فرد کَہ دے کہ 'یہ تو مَیں بھی کہہ سکتا ہوں'، لیکن آپ لکھنے یا کہنے بیٹھیں گے تو آپ کو یوں لگے گا کہ آپ کو عمر نوح بھی مل جائے تو نہیں کَہ سکتے۔ اسے 'سہل ممتنع' کہتے ہیں۔

مولانا کی نثر پر یہ اصول وارد کرکے دیکھیے تو ان کی ایک کتاب: اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی کے علاوہ مولانا کے ہاں نثر کا اصطلاحی انداز نہیں ہے۔ یہ تھوڑی مشکل

کتاب ہے۔ اور باقی ہر جگہ پڑھنے والے کو لگتا ہے کہ میں پوری بات سمجھ گیا ہوں اور یہ کہ مجھے اس فقرے یا پیراگراف کو دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنے احساس میں صحیح ہوتا ہے کیونکہ مولانا کو پڑھنے والا ان کی بات کو سمجھنے کا اعتماد پیدا کرلیتا ہے اور اسے متن پر دوسری نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ تاہم، دیکھیں تو آج کل جماعت اسلامی کے اکثر لوگ مولانا کی تحریروں پر پہلی نظر ڈالنے سے بھی دُور دکھائی دیتے ہیں۔ بات ہو رہی تھی کہ انھیں پہلی بار ہی پڑھتے ہوئے پتا چل جائے گا کہ جو مفہوم میں نے سمجھا ہے وہ صحیح ہے، کامل نہیں ہے۔ یہ نثر کا کمال ہوتا ہے کہ آپ غلط مفہوم اخذ نہیں کریں گے لیکن جو مفہوم بھی آپ اخذ کریں گے، وہ صحیح اور آپ کے لیے کافی ہونے کے باوجود مکمل نہیں ہوسکتا ہے۔ میں ایک مثال عرض کرتا ہوں۔

مولانا کا ایک مضمون نیاز فتح پوری [م: ۱۹۶۶ء] کے رَد میں ہے اور ان کے دورِ جوانی کا لکھا ہے۔ اس کا عنوان ہے: 'تجدد کا پائے چوبیں'۔ اس لفظ کو لغت میں دیکھنے کی ضرورت ہوگی تو وہاں سے دیکھ لوں گا۔ لیکن اگر یہ لفظ کہیں سکول میں سیکھا اور پڑھا ہوا ہے تو میں اس عنوان کو پڑھ کر ٹھٹھک نہیں جاؤں گا اور یہ عنوان کسی چیلنج کی طرح نہیں لگے گا، بلکہ بے ساختہ داد دوں گا کہ واہ! کیا عنوان ہے لیکن یہ تب ہوگا، جب آپ کو 'پائے چوبیں' کی بنیاد اور اصل کا پتا ہے، اگر آپ یہ جانتے ہیں کہ مولانا نے یہ لفظ کہاں سے لیا ہے؟ اور پھر وہ تجدد کو اس سے کیوں نسبت دے رہے ہیں؟ مگر افسوس کہ آج عام صلاحیت کا آدمی یہ نہیں دریافت کرسکتا، اگرچہ یہ ہے 'سہل ممتنع'۔

اسی طرح ان کے کچھ مشہور فقرے ہیں، جیسے 'آج کل کے الیکشن شکاری کتوں کی دوڑ ہیں'، یا 'یہ انتخابی نظام ایسا ہی ہے کہ زہریلے دودھ کو بلو کر جو مکھن آپ نکالتے ہیں، یہ پارلیمنٹ اس زہریلے دودھ کا مکھن ہے'۔ آپ اس جملے سے خوش بھی ہوگئے اور آپ کو یہ بھی لگا کہ اس پہ شعر کی طرح واہ واہ کہنی چاہیے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں آپ کو ایک گہری علمی رمز کے ساتھ ساتھ مزاح کی چاشنی بھی محسوس ہوگی۔ 'مزاح' اس چیز کو کہتے ہیں کہ بڑی سے بڑی بات کو ہنستے کھیلتے بیان کر دینا۔ مولانا کے ہاں یہ خوبی بھی موجود ہے۔ بہرحال، اگر آپ شاعری کی روایت کو تھوڑا سا جانتے ہیں تو یہ دیکھیں کہ مولانا جلال الدین رومیؒ [م: ۱۲۷۳ء] نے فرمایا تھا:

پائے استدلالیاں چوبیں بود پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

یعنی یہ جو دین کو فلسفہ بنانا چاہتے ہیں، ہر بات پر استدلال کروانا چاہتے ہیں، یہ جس جگہ کھڑے ہیں اور جس پاؤں پہ کھڑے ہیں، وہ لکڑی کا ہے، اور لکڑی کا بنا ہوا پاؤں زیادہ دیر تک تمھارا بوجھ برداشت نہیں کرسکتا، وہ اس رفتار سے چل نہیں سکتا۔ اب اس فہم کے ساتھ یہ عنوان جیسے جگمگانے لگتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہماری مذہبی نفسیات کے منفی پن کا ازالہ بھی کرسکتا ہے۔ مولانا رومی اور مولانا مودودی دونوں بالکل الگ شخصیتیں ہیں۔ مگر یہاں ان دو انتہائی مختلف شخصیتوں میں ایک زندہ اور پسندیدہ ربط آپ کو اپنے اندر محسوس ہوگا۔

مولانا مودودی کی نثر کے ایک اور وصف کا ذکر کرتا ہوں:

اچھی نثر کی یہ خوب صورتی ہے کہ لکھنے والا اپنی شخصیت کا پورا اظہار کردے۔ جیسے شاعری کا یہ عیب ہے کہ آدمی اپنی شخصیت کے گرد گھومتا رہے، لیکن نثر میں یہ خوبی ہے کہ آپ اپنی شخصیت کا پورا اظہار کرنے کے لائق ہوجائیں، اور آپ کی نثر صیغۂ واحد متکلم کو استعمال کیے بغیر آپ کا پورا تعارف کروادے۔ مولانا کی نثر اس معیار پہ پوری اُترتی ہے۔

رومن فلاسفر کیسیس لونجائینس [م: ۲۷۳ء] نے لکھا تھا کہ ہومر [م: اندازاً ۶۰۰ ق م] کے یہاں اگرچہ لفظ 'میں' نہیں ہے، لیکن اس کی ہر تحریر کا منبع وہ خود ہے۔ ہومر وہ شخصیت ہے کہ جس کا نام آدمی بہت احترام کے بغیر لے نہیں سکتا، خواہ وہ شیکسپیئر [م: ۱۶۱۶ء] ہی کیوں نہ ہو۔ لونجائینس کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا کام دراصل اس کا نام آئے بغیر اس کا کامل اظہار ہے۔ وہ اپنے تحریری کام میں کہیں موجود نہیں ہے۔ اس کے کام میں کبھی 'مَیں' کا صیغہ استعمال نہیں ہوا۔ 'مَیں' جب بھی استعمال ہوا ہے، وہ کسی کردار کا حصّہ ہے، لیکن اس کا سارے کا سارا کام خود ہومر کا اظہار ہے۔ وہ ہومر کہ جس کی شخصیت نے یونانی تہذیب کا سنگِ بنیاد رکھا ہے۔

نثر کی اس تعریف کو اگر ذہن میں رکھ کر مولانا کی نثر کا تجزیہ کیا جائے، تو مولانا اپنی علمی تحریروں میں جہاں کہیں بھی صیغۂ واحد متکلم استعمال کرتے ہیں، وہ ایک واقعاتی پس منظر میں ہوتا ہے۔ فلاں نے مجھ سے یہ پوچھا یا فلاں کو میں نے یہ جواب دیا۔ یہ سب ایک واقعاتی یا ایک معمول کی شخصیت کا 'میں' ہوتا ہے۔ وہ جہاں جہاں بھی بڑی باتیں کرتے ہیں، وہاں وہ خود کو مکمل طور پہ اس سے علیحدہ رکھتے ہیں، مطلب یہ کہ متن کا حصّہ نہیں بنتے۔ متکلم اگر اپنے متن سے باہر نکلا رہے تو اس سے

بڑا نہ کوئی آدمی ہوتا ہے، اور نہ اس سے بڑا کوئی کرافٹ مین [استاد کار اور ہنرشناس] ہوتا ہے۔

مولانا مودودی کی نثر ان کی شخصیت کو سمجھنے اور جاننے میں معاون ہے۔ خیالات تو چھوٹے لوگوں کا تعارف ہوتے ہیں۔ اپنی ذات سے مکمل بے نیازی اور لاتعلقی ان کی اتنی سچی تھی، اتنی استقامت کے ساتھ تھی کہ یہی بے نفسی اور یہی بے خودی ان کے اسلوبِ تحریر سے چھلکتی ہے۔ دراصل مولانا نے خود کو چھپا کر اپنے آپ کو ظاہر کیا ہے اور جو آدمی اپنے چھپاؤ کے ساتھ اظہار کی قوت پا جائے، اس سے زیادہ ظاہر کوئی نہیں ہوتا۔

مثال کے طور پر مولانا کے Major Themes یا برتر اور بنیادی مضامین اور ان کی فکر کے بنیادی اجزا کا بیان ان کے قلم سے پڑھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ مولانا سوچ کر نہیں لکھ رہے۔ وہ اپنے خیال کو بحث و مباحثہ کر لینے کے بعد اس کا اظہار نہیں کر رہے، بلکہ وہ کسی divine trance [ربانی تفکر] میں لکھ رہے ہیں۔ مولانا کی اس نثر کا بہاؤ ایسا ہے کہ وہ عمومی اظہارِ خیال کا بہاؤ ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسا بہاؤ کہ جو ادراک میں نہیں ہوسکتا۔ وہ بہاؤ جب ادراک میں نہیں ہوسکتا تو پھر اظہار کے پیکر میں کیسے آ سکتا ہے؟ ذہن میں رہے کہ آدمی نقطوں میں سوچتا ہے اور پھر جب کچھ نقطوں کو جوڑنے میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے تو ان کو بیان کر دیتا ہے۔ لیکن یہ بہاؤ ایک لکیر کی طرح، ایک رودِ آب کی طرح کہیں سے بھی رخنہ ڈالے بغیر چلتا چلا آ رہا ہے۔ دراصل یہ چیز اللہ سے تعلق کے بغیر، اللہ پر خود کو نثار کیے بغیر، اللہ کی کتاب کو اپنے لیے کتابِ وجود بنائے بغیر ممکن نہیں ہے۔

گویا متکلم ہی کلام ہے۔ مولانا کی فکر، تکلم اور اظہار میں آ کر ان کے اس مرتبے پر زیادہ شہادت دیتی ہے کہ یہ شخص روایتی اصطلاح میں فنا فی اللہ ہے۔ فنا فی اللہ کا مطلب یہ ہے کہ فرد کی انتہائی جبری خواہشات بھی اللہ کے لیے پسندیدہ بن جائیں۔ بہت چھوٹی چھوٹی خواہشات بھی اللہ کی خوش نودی کی اطمینان بخش ضمانت بن جائیں۔ ایسا شخص فنا فی اللہ ہوتا ہے۔ جیسے ہم سب نے دیکھا ہے کہ مولانا کی یکسوئی، ان کی consistency [ثابت قدمی] اور دُنیا سے بے رغبتی درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ بڑی واضح سی بات ہے کہ دین آپ کو اپنا جزوی یا چھوٹا یا بڑا ترجمان بنا ہی نہیں سکتا۔ وہ آپ کو ترجمانی کے منصب پر بیٹھنے بھی نہیں دے گا چاہے وہ جمعہ کا وعظ کہنے کے لیے ہو، جب تک کہ آپ کا دل دُنیا سے بے رغبت نہیں ہوتا۔ دُنیا سے بے رغبتی شرطِ دین ہے۔ دُنیا سے

بے رغبت ہوئے بغیر اسے بدلا نہیں جاسکتا۔ یہ مولانا کی زندگی، ان کی تحریر اور اس تحریر میں ان کی اپنی طرف سے چھپائی ہوئی شخصیت کا اللہ کے فضل سے اظہار ہے، اور یہ بہت بڑی بات ہے۔

ایک سادہ سا قاعدہ، ادب پڑھنے والوں کو معلوم ہے۔ اچھی نثر کی چھے قسمیں یا جہتیں ہوتی ہیں، یا چھے طرح کے نثری اسالیب ہوتے ہیں۔ انھی میں ایک اسلوب ہے: 'نثرِ مرسل'۔ 'نثرِ مرسل' کسی ایسی نثر کو کہتے ہیں، جس کو کسی آرایش کی ضرورت نہ ہو، جس کو کسی رُموز اوقاف کی حاجت نہ ہو، جسے متکلم اس اعتماد کے ساتھ لکھے اور کہے کہ میں نے اپنا مُدعا پورا بیان کر دیا ہے اور یہ پورا مُدعا بغیر کسی تفریق کے میرے تمام قارئین تک منتقل ہوگیا ہے۔ ارسال اور ترسیل کرنا، یہ 'نثرِ مرسل' ہے۔

درحقیقت اُردو کی 'نثرِ مرسل' کا بہترین نمونہ، مولانا مودودی کی نثر ہے۔ یہ کیوں بہترین نمونہ ہے؟ ایک تو 'نثرِ مرسل' یہ ہے کہ میں آپ کو لکھ کر دے دوں کہ آپ فلاں جگہ آجایئے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو فلاں جگہ کا پتا ہے لیکن ایک آدمی کہتا ہے کہ 'آجاؤ فلاح کی طرف'۔ اس میں اظہارِ مُدعا پورا ہے۔ اس کا فہم منحصر ہے آپ کے فہم فلاح پر۔ مولانا مودودی کی 'نثرِ مرسل' اس دوسری نوع کی 'نثرِ مرسل' ہے، جہاں وہ پورے اعتماد سے بات کرتے ہیں کہ انھوں نے پوری بات کہہ دی ہے، اور ان کے قریب والے جو اس زمانے میں ان کے مخاطب تھے، وہ ان کے اس اعتماد کو تقویت پہنچاتے تھے۔

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ قاری نے کیا سمجھا ہے؟ اس کی کوئی ضمانت نہیں۔ یہ بات میں ایک خاص وجہ سے عرض کر رہا ہوں۔ جس تہذیب میں لفظ اور کمیونی کیشن کرپٹ ہوجائے، Vulgar [ذلیل] ہوجائے، Profane [بے ہودہ اور ناپاک] ہوجائے، اس تہذیب کے زندہ رہنے سے، اس تہذیب کا مرنا اچھا ہے۔ جہاں آدمی کا تعلق لفظ کے ساتھ صرف بازار سے سودا خریدنے کی صلاحیت تک محدود ہوکر رہ جائے، تو اسے خود کو آدمی کہلانے کا حق نہیں ہے۔ آدمی وہی ہے، جو لفظ کو اپنی تہذیبی تعمیر کی بنیاد بنانے پر قادر ہو۔ جو لفظ میں موجود معنوی امکانات کو تجربے میں ڈھالنے کے لائق ہو۔ جو لفظ میں حاضر و موجود معنویت کو سمجھ کر، اس معنویت میں اپنے تخیل یا عمل وغیرہ سے اضافہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہ سب کہاں ہے؟

جماعت اسلامی کے وابستگان میں آج کتنے لوگ ہیں جو مولانا مودودی کی فکر سمجھتے یا ان پر وارد ہونے والے اعتراضات کا دفاع کرسکتے ہوں؟ ایک ایسے آدمی کی فکر کا دفاع کہ جس نے دُنیا

میں موجود کسی بھی بڑے فکری، علمی، عملی اور تہذیبی تھیم کو نظرانداز نہیں کیا تھا۔ دُنیا پر اثرانداز ہوسکنے والے کسی بھی نظریے کے چیلنج کو انھوں نے قبول کیا اور اس کا جواب حددرجہ متانت اور مسکت دلائل سے دیا۔ بڑھیں ہانک کر یا نعرے لگا کر نہیں، بلکہ متانت سے جواب لکھا اور جواب ایسا ہے کہ جو خود اس نظریے کے قائل کئی لوگوں کی اصلاح بھی کر دیتا تھا مگر اب وہ معاملہ نہیں رہا۔

میرے مشاہدے میں ہے کہ مولانا پر بہت سے اعتراضات چاہے، وہ معاندانہ اعتراضات ہوں اور چاہے وہ مخلصانہ اور محققانہ اعتراضات ہوں، ان کا جواب نہیں آرہا، اور اس کا جواب اس لیے نہیں آرہا کہ اب جیسے یقین کرلیا گیا ہے کہ انقلاب وغیرہ کو چھوڑو، بس تھوڑا بہت نظام میں اختیار حاصل کرلو تو یہی کافی ہے۔ میں موجودہ جماعت اسلامی کے وابستگان سے اس بات کی شکایت رکھتا ہوں کہ انھوں نے مولانا کی علمی وراثت کو بہت ثانوی اور نچلے درجے پر رکھ دیا ہے۔ کوئی علمی سرگرمی نظر نہیں آتی۔ علمی وراثت نہ نبھا سکے کہ وہ صلاحیت کی بات ہے، وہ چلو مان لیا۔ لیکن ان کی کرداری وراثت کے تسلسل میں بھی موجودگی نہ ہو تو پھر وجود کے جواز کا سوال پیدا ہوجاتا ہے۔ اگر اپنے بانی کے کرداری تسلسل کو افراد محفوظ نہیں رکھے ہوئے ہیں تو پھر بہت خوف ناک بات ہے۔

مولانا مودودی سے ایک مرتبہ کسی نے پوچھا کہ ''آپ اتنی بڑی بڑی باتیں بہت آسانی سے کس طرح لکھ لیتے ہیں؟'' انھوں نے کہا کہ ''خیالات اپنے اظہار کا سانچا خود لے کر آتے ہیں، یعنی خیالات جن الفاظ سے مناسبت رکھتے ہیں وہ خیالات انھی الفاظ میں آتے ہیں، اور انھی کو لکھ دیتا ہوں''۔ بظاہر یہ سادہ سی بات ہے، لیکن ایک بہت بڑے لسانیاتی قانون کی بنیاد ہے۔

یہ وہ سطح ہے، جہاں معانی اور لفظ، essence [جوہر] اور form [شکل] اپنی دوئی کو ختم کر کے ایک زیادہ برتر وحدت کا حصّہ بن جاتے ہیں۔ جیسے لفظ الگ ہے اور معنی الگ ہے۔ یہ اللہ کی عطا ہے کہ ایک آدمی ایسی صلاحیتِ ادراک اور ایسی قدرتِ اظہار کے ساتھ آتا ہے کہ وہ لفظ اور معنی کی دوئی کو ختم کر کے انھیں اللہ کی طرف سے بنائی گئی ایک وحدتِ حقیقی کا حصّہ بنا دیتا ہے۔ جو اس دوئی کو ختم کردے، وہ زبان کا احسان مند نہیں ہے بلکہ زبان کا محسن ہے، اور جو اس دوئی کو ختم کردے، وہ ذہن کا محتاج نہیں ہے بلکہ ذہن کا مربی ہے۔ اور مولانا مودودی، لفظ، زبان، خیال اور اظہار کی وحدت پر قادر تھے۔